فکر و نظر............ اسلام آباد　　　　جلد: ۴۶　　شمارہ: ۲،۱

ہمارے ادب کے آفاقی رشتے☆

(شاعری کے حوالے سے ایک مطالعہ)

ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی

آفاقیت بڑے ادب کی بنیادی صفت ہے۔ انسانیت کے عظیم ذہن جس افق پر اپنے فکر و احساس کی عزیز ترین متاع عالم انسانیت کے حضور پیش کرتے ہوئے زمان و مکاں کے قیود کو توڑ دیتے ہیں، وہ فنون لطیفہ کا افق ہے اور بالخصوص ادبیات کا۔ بڑا ادیب اپنے عہد کی پیداوار، اپنی قوم کا فرد اور اپنی روایات کا پروردہ ہوتے ہوئے اس جہانِ تازہ کی تخلیق کرتا ہے جو سنگ و خشت سے نہیں بلکہ افکار تازہ اور خونِ دل سے پیدا ہوتا ہے۔

''آفاقیت کسی فن پارے کی وہ خصوصیت ہے جس کی بناء پر اس کی معنویت کسی مخصوص واقعہ، صورت حال، مقام، زمانے اور شخصی حدوں کو توڑتی ہوئی اپنے آپ کو اس آفاق اور کائنات پر محیط کر دیتی ہے''۔ اقبال کی نظم مسجد قرطبہ کسی ایک مسجد سے متعلق نظم نہیں ہے بلکہ وہ اسلام کے تصور جمال اور جمالیاتی قدروں پر خلاقانہ تبصرہ ہونے کے ساتھ ساتھ زمان و مکاں کے جبر اور انسانی ذات کے درمیان کشمکش اور انسان کی آبرومندی کی دستاویز ہے۔ شکسپیئر کے اوتھیلو Othello کا موضوع وہ ازدواجی شک و شبہ ہے جو آئے دن قتل کا محرک بن کر اخباری خبروں کو جنم دیتا ہے اور بس۔ اوتھیلو نہ کسی تاریخی واقعہ کے پس منظر میں لکھا گیا، نہ یہ بدکاری، قتل اور خودکشی کے واقعاتی امکان تک محدود ہے، بلکہ شکسپیئر نے اس موضوع کو انسان اور حیاتِ ارضی کی ایک آفاقی صداقت کے درجہ تک پہنچا دیا ہے۔

آفاقیت کی تخلیق اسی وقت ممکن ہے جب فن کار زندگی کو ایک کُل کے طور پر دیکھ سکے۔ سعدی کی گلستان کے مختلف ابواب زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نقش گری کا درجہ رکھتے ہیں۔ بادشاہوں کا دور گزر گیا مگر گلستان میں شاہوں کے واقعات ان کی سطح سے ابھر کر ہماری زندگی کے مسائل بننے کی تاب و توانائی رکھتے ہیں۔ اپنے ادب کی حالیہ مثال کے طور پر سعادت حسن منٹو کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ بُو اور کالی شلوار جیسے افسانوں میں جنس کا مسئلہ، منٹو کی پوری دنیا معلوم ہوتا ہے مگر موذیل،

☆ یہ مقالہ کل پاکستان اہل قلم کانفرنس ۱۹۸۱ء اسلام آباد میں پڑھا گیا۔

کھول دو اور ٹھنڈا گوشت میں یہی مسئلہ انسانی زندگی کے دوسرے پہلوؤں اور انسانی فطرت کے خیر و شر سے ہم آمیز اور ہم آہنگ ہو کر ادبی ترفع (Sublimation) کے عمل کی مثال بن جاتا ہے۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا وہ فن کار کی فنی عظمت اور قد و قامت کی نسبت سے عرض کیا گیا ہے۔ اس گفتگو کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ادب کی آفاقیت کی تشکیل میں کئی اور عناصر بھی کارفرما نظر آتے ہیں۔ موضوع کی عظمت اور ہمہ گیری ادب کی آفاقیت کی ایک بنیاد ہے۔ کانٹ نے حسن کو یقین کے ساتھ اور ترفع اور رفعت کو لامحدود کے ساتھ وابستہ کیا تھا۔ ادب کی صفات اور خصوصیات کا اظہار یقیناً زبان کے وسیلہ سے ہوتا ہے اور عظمت ادب کے مخارج کا یقیناً زبان پر گرفت سے گہرا تعلق ہے لیکن عظیم تصورات، طاقت اور الہامی جذبہ اور کلیت یا مجموعیت کے بغیر ادب آفاقی نہیں بن سکتا۔ ان عناصر کے بغیر صرف قدرتِ زبان اس سطح سے بلند نہیں ہوتی۔

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے
ایک ذری آپ کو زحمت ہوگی
ذرا ڈال دو اپنی زلفوں کا سایہ
مقدر کسی کا بہت نا رسا ہے

....

زلف اُلجھے گی تو شانے سے سُلجھ جائے گی
دل جو اُلجھے گا تو کوئی نہیں سُلجھائے گا

اور جب عظیم تصورات اور زندگی کا وسیع تر مطالعہ و مشاہدہ زبان سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے تو شاعری اس سطح پر فائز نظر آتی ہے:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہٗ شیشہ گری کا

(میر)

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب!
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا، پایا

(غالب)

یہ کائنات چھپاتی نہیں ضمیر اپنا
کہ ذرہ ذرہ میں ہے ذوق آشکارائی

کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبار جہاں
نگاہِ شوق اگر ہو شریکِ بینائی

(اقبال)

(۲)

کائنات کی وحدت کا عرفان، انسان، حیات اور کائنات کے رشتہ کا ادراک، اور خالق و مخلوق کے تعلقات کی جہتیں اگر کسی انسانی گروہ کو اپنے ثقافتی ورثہ کے طور پر حاصل ہو جائیں تو اس کے شعر و ادب، فنِ تعمیر اور دوسرے فنونِ لطیفہ میں آفاقیت کا جلوہ مختلف سطحوں پر بے نقاب نظر آئے گا۔ اس انسانی گروہ کے بڑے فن کار آپ کو کاروبار جہاں کو نئے انداز سے دیکھنا سکھائیں گے، اس کے متوسط درجہ کے فن کار آپ کو آفاق اور انسان کی وحدت کے گیت گاتے نظر آئیں گے اور اس کے عام لکھنے والوں اور فن کاروں کے ہاں بھی جغرافیائی حدود ٹوٹتی ہوئی نظر آئیں گی۔ دنیا میں کہیں بھی ظلم ہو رہا ہو اس کے ادیب اور شاعر اس ظلم کے خلاف لب کُشا نظر آئیں گے۔ امیر مینائی کا شعر اسی پس منظر میں پڑھیئے تو اندازہ ہوگا کہ نہایت درجہ شہرت اور مقبولیت کے باوجود یہ شعر مبتذل کیوں نہیں معلوم ہوتا:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اُردو اور برعظیم پاک و ہند کی دوسری زبانوں کے مسلمان ادیبوں کے ہاں آپ کو یہ آفاقیت اور بین الاقوامی نقطہ نظر کم و بیش ہر جگہ نظر آئے گا۔ جنگ طرابلس، جنگ بلقان، اور دولت عثمانیہ کے زوال سے لے کر کشمیر، ویت نام، فلسطین، الجزائر، افریقہ، افغانستان، ہنگری، چیکوسلواکیہ اور پولینڈ کے مظلوموں تک۔ ہر جگہ اور ہر ملک کی تحریک آزادی کی معاونت ہمارے اہل قلم نے اپنی آواز اور فن کے ساتھ کی ہے۔

میرے اس معروضے کی صداقت اس وقت آپ پر اور روشن ہو جائے گی، جب برعظیم کی مختلف زبانوں میں لکھنے والے مسلمان اور غیر مسلمان ادیبوں کی تحریروں کا جامع جائزہ اس نقطہ نظر سے لیا جائے۔ برعظیم کے ذہن و فکر کو اسلام نے اس درجہ متاثر کیا ہے کہ بہت سے غیر مسلم فن کاروں کے ہاں فکر کی عالم گیریت اسلامی آثار و اثرات سے عبارت ہے۔ میں یہ ہرگز نہیں کہہ رہا ہوں کہ غیر مسلموں کے یہاں یہ آفاقی نقطہ نظر اور انسانی محبت و عظمت کے تصورات نہیں ملتے۔ کہنا یہ ہے کہ

مسلم معاشرہ اور اس کے فن کاروں کے ہاں یہ رجحان بہت عام اور قوی نظر آتا ہے۔ میں حسان بن ثابت، سعدی، مولانا روم، حافظ، خسرو، میر، غالب، اقبال، جائسی اور نذرالاسلام کی طرح ہومر، کالی داس، گوئٹے، شکسپیئر اور دانتے سے بھی دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ان بڑے فن کاروں میں سے بعض ایک آفاقی ورثہ سے محرومی کی وجہ سے کہیں کہیں جس سطح تک گر جاتے ہیں اس کی تاویل کچھ ایسی مشکل نہیں۔ میں صرف دانتے کی مثال دوں گا۔

اب میں آج کے موضوع کے تین الفاظ کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ پہلا لفظ تو ''ہمارے'' ہے۔ میری مادری زبان پوربی ہے جسے ہمارے بزرگوں کی طرح مخدوم و مکرم ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی آج بھی پکی بولی کہتے ہیں، لیکن ادب کی سطح پر اُردو ادب میری زندگی میں پہلے آیا۔ پاکستان کی نسبت سے میں ''ہمارے ادب'' کے دائرے میں قومی زبان اُردو کے ادب کے علاوہ تمام پاکستانی زبانوں کے ادبیات کو بھی شامل کرتا ہوں۔ پشتو، پنجابی، سندھی، بلوچی، سرائیکی، شنا، ہندکو اور گجراتی وغیرہ تمام زبانوں کے ادب میں ہمیں یہ آفاقی عناصر نظر آتے ہیں کیوں کہ زبانوں کے اختلاف کے باوجود ان تمام زبانوں کے ادیب اسی انسانی گروہ کے فرد ہیں جسے آفاقیت اپنے ورثہ کے طور پر ملی ہے۔ ان ادیبوں نے تو اسی آفاقیت کے پرچار کی خاطر زبانوں کی دیواریں بھی توڑ کر ہمیں زبان کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے ایسا مثبت نقطہ نظر عطا کیا ہے جس سے آج ہم میں سے بہت سے محروم ہیں۔ سعادت یار خان رنگین اور انشاء نے اُردو، فارسی، پنجابی، کشمیری، عربی اور دوسری زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ حضرت سچل سرمست فارسی میں آشکارا اور فدائی تخلص کرتے تھے، پنجابی اور اُردو میں سچل سرمست اور سندھی میں سچو۔ اقبال نے اپنے پیغام کی اشاعت کے لیے فارسی، اُردو اور انگریزی سے کام لیا۔ کاش میں تمام پاکستانی زبانوں کے حوالے سے گفتگو کر سکتا، لیکن اس بات میں خاصا عاجز ہوں، اس لیے اُردو کے علاوہ پنجابی اور سندھی شاعری کے مختصر حوالوں تک بات کو محدود رکھوں گا۔ ویسے خوشحال خان کی عظمت سے تو ہمیں ہمارے قومی شاعر اقبال نے آشنا کرایا تھا اور اس سلسلہ کی آخری کاوشیں جناب خاطر غزنوی کا ترجمہ دستارنامہ اور جناب نعیم نقوی کی کتاب خوش حال خان خٹک اور اقبال ہے جن میں انہوں نے مسلسل مثالوں کے ذریعہ خوشحال خان کو اقبال کا پیشرو قرار دیا ہے۔

دوسرا لفظ ''آفاقی'' ہے۔ اس اصطلاح کے سلسلہ میں جو کچھ عرض کروں گا اس سے یہ بات آشکار ہو جائے گی کہ ہمارے ادب کے آفاقی رشتوں میں سب سے اہم رشتہ، بلکہ تمام رشتوں کی اساس کون سا رشتہ ہے۔

آفاق، افق کی جمع ہے۔ افق کنارے کو کہتے ہیں۔ جو کچھ زمین اور آسمان کے اطراف سے نظر آئے وہ افق ہے۔ ابن فارس کے مطابق ''افق'' کسی چیز کے اطراف و جوانب کے درمیان وسعت اور انتہائی بُعد'' کا نام ہے۔ یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ یہ انتہائی بُعد بھی ایک ہی رشتہ میں پرویا ہوا ہوتا ہے۔ قرآن پاک کی آیت ہے:

﴿سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ﴾ [حم السجدہ ۴۱: آیت ۵۳]

''ہم عنقریب انہیں اپنی آیات ان کے گرد و نواح (دنیا کے اطراف و جوانب) میں اور خود ان کے نفس (ذات) میں دکھا دیں گے''۔

اس آیت سے آفاق کے معانی اپنے تمام مفاہیم کے ساتھ ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ آفاق میں خارجی کائنات، حیاتِ انسانی، انسان کی دنیا، قومی اور بین الاقوامی حوادث اور واقعات سب ہی شامل ہیں۔ آفاق کے اس مفہوم کے پیش نظر ادب کی بین الاقوامیت اور بین الاقوامی رشتے بھی اس موضوع کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس وسعت کے ساتھ ساتھ افق اور آفاق کے لفظ میں انتہائی وسعت اور بلندی کا جو بنیادی مفہوم موجود ہے اسے مناسب اہمیت دینے سے ادب میں علویت اور رفعت کے نکتہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اس کائنات اور حیاتِ انسانی کی وسعتوں میں توازن پیدا کرنے کے لیے رب المشارق والمغارب نے ایک امت وسطیٰ قائم فرمائی اور حضورﷺ کے طفیل یہ شرف ہمیں حاصل ہوا۔ مشرق و مغرب کے افقوں کے درمیان جو بُعد ہے اسے وحدت اور یکتائی میں یہی اُمت بدل دیتی ہے:

﴿قُل لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِىْ مَن يَّشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ. وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطاً لِّتَكُونُواْ شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ [البقرہ: ۳-۱۴۲]

''اے نبیؐ! ان سے کہہ دیجیے کہ مشرق و مغرب سب اللہ کے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم بتا دیتا ہے اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک ''امت وسط'' بنا دیا ہے تاکہ تم لوگوں (عالم انسانیت) پر شاہد اور رسول تم پر شاہد ہو''۔

مشرق و مغرب اللہ کا ہے۔ یہ ایک فقرہ آفاقیت اور عالم گیریت کی بنیاد محکم ہے۔ اور پھر امت وسطیٰ کا کام یہ ہے کہ وہ عدل، توازن اور توسط پر قائم ہو اور دوسروں کو عدل و توازن عطا کرے۔ امت وسط کو اقوامِ عالم کے درمیان مرکزی حیثیت حاصل ہے اور اس کا فاصلہ دنیا کی ہر قوم سے یکساں ہوگا۔ اس کا تعلق ''سب کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا تعلق'' ہوگا اور ''ناحق، ناروا تعلق''

کسی سے نہ ہو گا۔

یہ ہے وہ آفاقیت اور عالم گیریت جو مسلمان کو اپنے ثقافتی ورثہ کے طور پر ملی ہے۔ مسلمان کا جہاں بے حدود ہے کیوں کہ اس کا رب رب العالمین ہے اور یوں وحدت انسانی اس کا مقصود ہے۔

قرآن حکیم ہمارے ادب ہی نہیں بلکہ ہماری زندگی کے آفاقی رشتوں کا سرچشمہ ہے۔ اسی چشمہ کا یہ فیض ہے کہ ہمارے لیے یہ کائنات ایک محل کی طرح ہے اور سارے مقامات، محل وقوع اور مناظر اس محل کے لاکھوں دروازوں اور کروڑوں کھڑکیوں کی طرح ہیں اور جس دروازے اور جس کھڑکی سے دیکھیے، وہی صاحب تخلیق کُل نظر آئے گا۔ حضرت شاہ عبدالطیف بھٹائیؒ کے الفاظ میں:

اک قصر در لک کوڑین کٹس گر کیون
جید اُنھن کریان پرک تید اُنھن صاحب ساموں

''(محل ایک ہے۔ دروازے لاکھوں، کھڑکیاں کروڑوں، جہاں دیکھتا ہوں وہاں صاحب یعنی محبوب کھڑا ہے) اور محبوب کا یہ جلوہ آفاقیت کا جلوہ ہے''

اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو دین عطا کیا ہے وہ اسلام ہے جسے عہد حاضر کے ذہنوں کی تفہیم کے لیے اسلامی نظریہ اور اسلامی نظامِ حیات بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا سبب غالبًا یہ ہے کہ جدید ذہن مذہب کو محض عبادات تک محدود جانتے ہیں یا مغرب کی تقلید میں زندگی کی ثنویت کے قائل ہیں کہ قیصر کا حق قیصر کو دو اور کلیسا کا حق کلیسا کو۔ نظریۂ حیات اور نظامِ حیات کی اصطلاحوں کے ذریعہ ان ذہنوں تک یہ بات پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام زندگی کے ہر شعبہ میں ہم سے اپنے ضابطوں کی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے۔

اسلامی اقدار کا آفاقیت اور ادبی تصورات و نظریات کی تشکیل سے گہرا رشتہ ہے۔ اسلام انسان کو مجبور مطلق نہیں مانتا۔ افلاطون اور ارسطو کے نظریہ نقالی فطرت کی جگہ ہمارا شاعر تو یہ کہتا ہے:

فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے
آئینہ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

اس ادبی تصور کا گہرا رشتہ قرآن کے اس ارشاد سے ہے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسے تمہارے لیے مسخر کیا گیا۔

قرآن حکیم کی ایک عظیم قدر تکریم آدم ہے:

﴿وَ لَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ﴾ [بنی اسرائیل: ۷۰]

''اور ہم نے انسان کو بحیثیت انسان عزت اور کرامت دی''۔

اسی آیت کی تفصیل، ایک ابدی بازگشت کی صورت میں خطبہ حجۃ الوداع میں ملتی ہے۔ ایام جاہلیت کے دستور حضور نبی کریم ﷺ کے قدموں تلے کچلے گئے۔ سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سفید پر، عرب کو عجمی پر اور عجمی کو عرب پر کوئی فضیلت نہ رہی۔ انسان کا مرتبہ یہ ٹھہرا کہ وہ زینت دہ بزمِ امکاں بن گیا۔ انسان تو اس آئینہ کائنات کا چہرہ ٹھہرا۔

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ
آئینہ تھا تو مگر قابل دیدار نہ تھا

....

کچھ آئینے سے رکھے ہوئے ہیں سرِ وجود
اور ان میں اپنا جشن مناتی ہے میری ذات

اسی قدر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسانوں کے درمیان تفریق نہیں کی جا سکتی۔ جان، عزت اور مال کے تحفظ کے باب میں مسلم اور غیرمسلم برابر ہیں۔

اسلامی اقدارِ حیات کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ صرف اُن اقدار میں سے چند کی نشان دہی کافی ہے۔ ''انسانی آزادی'' اسلام کی ایک مستقل قدر ہے۔ انسان صرف اللہ کا عبد ہے اور اس کے سوا کسی کی محکومی اسے زیبا نہیں۔ اس قدر نے اُردو ادب اور ہماری دوسری زبانوں کے ادبیات میں کتنے ہی اسالیب کا جامہ پہنا ہے اور طرح طرح سے اس کا اظہار ہوا ہے۔ ''حریت'' اور ''عبدیت'' کا امتزاج صرف ہمارے ادب کی آفاقیت میں نظر آئے گا ورنہ اوروں کے لیے تو یہ ایک تضاد تھا اور ہے۔ ہمارے ہاں عبدیت، بلند ترین مرتبہ آدم کا اشارہ ہے۔

چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستان کی
یہ ہستی بینا ہے، دانا ہے، توانا ہے

....

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

''تعاون'' اور ''عدل'' بھی نہایت اہم اسلامی اقدار ہیں۔ اسلامی ادب میں ہر جگہ آپ کو انسانوں کے لیے عدل کا مطالبہ نظر آئے گا اور ان اقدار کے حصول کے لیے اسلام سے وابستہ فن کار

انسانوں کو تعاون، اتحاد اور عمل کا سبق دیتا ہوا نظر آئے گا۔

ان اقدار نے ایک ایسی آفاقیت کی تخلیق کی ہے جس کے تحت ہمارے فن کار نے عشق کو نورِ حیات اور نارِ حیات اور ظہور و سببِ ظہور کے طور پر پیش کیا ہے۔ انسان کے منصب اور عظمت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ جغرافیائی سرحدوں کو توڑ کر وحدت رب کے حوالے سے وحدتِ آدم کو اپنا نشان قرار دیا ہے۔ عربی، فارسی، اُردو، پنجابی، پشتو، سندھی، بلوچی، سرائیکی اور تمام ایسی زبانوں میں جن میں مسلمانوں کا تخلیق کردہ سرمایہ ادب ملتا ہے، یہ آفاقیت فنی محاسن اور شدید داخلی تجربے کے طور پر ابھری ہے۔ وہ شدید داخلی تجربہ جو باہر کی دنیا کو فتح کرتا ہوا ایک انسان کے دل کی شمع آرزو کو دوسرے دلوں میں روشن کر دیتا ہے۔

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

(میر)

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گُل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

(اقبال)

عشق جنھاں دی ہڈیں پینڈا
سوئی نرجیوت مر جاندا

(بلھے شاہ)

عشق فعل ہے، رب دی ذات فاعل، عاشق اوسدے سبھی مفعول میاں
ہیسی عشق ظہور ہے، عشق سارا عشق ہوسیا سدا معمول میاں

(وارث شاہ)

جی تون بیت پائین، سی آیتوں آھین
نیومن لائین، پریاں سندی پردی

(شاہ عبداللطیف بھٹائی)

محبت کی جہتیں کس طرح بلھے شاہ، شاہ عبداللطیف بھٹائی، وارث شاہ، میر اور اقبال کے کلام میں

ایک دوسرے کا ضمیمہ بن کر ہماری راہیں منور کرتی ہیں۔ عشق سبب ظہور ہے، عشق آدمی کے وجود کا عنصر بن جاتا ہے، عشق تو ہڈیوں کو گلا کر آدمی کی خاکستر سے نئے آدمی کو وجود میں لاتا ہے، عشق خدا کا فعل ہے' (عشق خدا کا کلام-اقبال) اور عشق ہی کلامِ شاعر کو آیاتِ قرآن کا عکس بنا کر محبوبِ حقیقی سے ملانے کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

اسلامی نظامِ فکر اور اقدار ہماری زبانوں کے ادب کی اساس اس طرح بنیں کہ ''زمین'' کہیں ان آفاقی تصورات پر غالب نہ آ سکی۔ ہمارے ایک نقاد نے اُردو شاعری کے مزاج اور تاریخ کو زمین کی رسیوں سے جکڑ دیا ہے۔ یہ ایک جزوی صداقت ہے جو جھوٹ سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ سچ ہے کہ کوئی حساس شاعر اپنے عہد، اپنے گرد و پیش کے طبعی ماحول اور رسم و رواج سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ اُردو غزل اور شاعری پر فارسی اثرات غالب رہے، لیکن بعد میں اُردو غزل کی زبان اور فضا خاصی حد تک فارسی کی گرفت سے آزاد ہو گئی۔ ہماری غزل اور شاعری پر ہندی اثرات اور برعظیم کے واقعات نے اثر ڈالا۔ اُردو کے علاوہ پنجابی، سندھی اور دوسری زبانوں کی شاعری میں بھی ہمیں مقامی اور ہندی موسم، تہوار اور رسوم نظر آتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندو مذہب کی اصطلاحیں اوّل اوّل اُردو میں فارسی کے وسیلہ سے آئیں جیسے دیر، بت کدہ، برہمن، لیکن بعد میں مذہبی اصطلاحات کے ساتھ ساتھ اُردو اور پنجابی شاعری میں زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے متعلق الفاظ بھی ہندی ذریعوں سے آئے۔ دکنی اُردو اور پنجابی شاعری میں تو نازک حقیقتوں کا اظہار شعراء نے عورت کی زبانی کیا ہے اور اس میں ریختی کی معکوسیت نہیں۔ یہ ہندی اثرات اُردو شاعری کے بارہ ماسہ اور پنجابی شاعری کے اٹھوارہ اور باراں ماہ میں نظر آتے ہیں۔ اُردو شاعری کے اسالیب، تشبیہ و استعارہ میں بھی یہ اثرات نظر آتے ہیں:

زلف ہے تیری موج گنگا کی
تل نزیک اس کے اک سناسی ہے

(ولی)

کب تلک دھونی جمائے جوگیوں کی سی رہوں
بیٹھے بیٹھے در پہ تیرے میرا آسن جل گیا

(میر)

لیکن یہ اُردو اور پاکستانی زبانوں کی شاعری کا صرف ایک چھوٹا سا گوشہ ہے۔ ہمارے ادب اور شاعری میں عربستان، ترکستان، وسطی ایشیا، ایران اور دوسرے ملکوں کی تلمیحات اسالیب، مقامات اور

اشیاء کا ذکر انسانی جذبات کی آفاقیت کے ساتھ ساتھ نمایاں تر ہے۔ برعظیم میں مسلمانوں کی ثقافتی تاریخ اس حقیقت کی شہادت ہے۔ اسلام ہر ملک اور ہر دور میں مسلمانوں کی قومیت کی اساس رہا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مختلف ادوار اور ممالک کے مخصوص تقاضوں کے پیش نظر اس کے ثقافتی اور خارجی مظاہر مختلف رہے ہیں۔ مسلمانوں نے ہر ملک اور اپنی تاریخ کے ہر دور میں اُن مقامی عناصر کو اپنے نظامِ زندگی میں جگہ دی ہے جن کا اُن کی دینی اقدار اور آفاقی تصورات سے ٹکراؤ نہ رہا ہو۔ ہولی کے گیت اُردو شاعروں نے لکھے ہیں۔ مسلمانوں نے ہوری کو ایک نیا ذہنی تہوار بنا دیا اور ہولی کے رنگوں میں اللہ کے صفاتی رنگ شامل کر دیے۔ حضرت بلھے شاہ کی ہوری پنجابی آمیز اُردو ہی میں لکھی گئی ہے:

ہوری کھیلوں گی کہہ بسم اللہ
نام نبی کی رتن چڑھی بوند پڑی اللہ اللہ
رنگ رنگیلی اوہی کھلا دے جو سکھی ہووے فنا فی اللہ
ہوری کھیلوں گی کہہ بسم اللہ
الست بربکم پیتم بولے سب سکھیاں نے گھونگھٹ کھولے
قالوا بلٰی ہی یوں کر بولے لا الہ الا اللہ
ہوری کھیلوں گی کہہ بسم اللہ
نحن اقرب کی بنسی بجائی من عرف نفسه کی کوک سنائی
ثم وجه الله کی دھوم مچائی وچ دربار رسول اللہ

یہ ہمارے ادب کے آفاقی رشتوں کی قوت ہے کہ ہوری کی فضا ہی بدل گئی۔ خود ہمارے عہد میں نگار صہبائی کے گیتوں کی فضا کو میں اسلام رنگ اور اسلام رس کہتا ہوں۔ جمیل الدین عالی کے ابتدائی دوہوں میں ہندی دوہوں کی شدید جنسیت کی جھلک بعد میں کویتا پاکستانی کا نقش بن گئی۔

برعظیم کے اسلامی فن تعمیر میں عجم کے ''حسن طبیعت'' عرب کے ''سوزِ دروں'' کے ساتھ برعظیم کے اثرات بھی ملتے ہیں۔ متحدہ ہندوستانی قومیت کے داعی ڈاکٹر عابد حسین بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اور مجموعی طور پر یہ دعویٰ درست ہے کہ مسلمانوں نے عربی، ایرانی اور ہندوستانی عناصر کو اپنے دینی، اجتماعی اور ثقافتی مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے فن تعمیر میں ہم آہنگ کر دیا۔ یہی عمل ہمیں برعظیم کے دوسرے فنونِ لطیفہ میں بھی نظر آتا ہے۔ مگر ہمارے بعض نقاد صرف دھرتی سے رشتہ استوار کرنے کی کوشش میں اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ بعض دوسرے نقادوں کے نزدیک ''کوہ

طور''، ''ناران''، ''جیوں''، ''دجلہ''، ''فرات'' کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہماری شاعری کا گرد و پیش کی زندگی سے کوئی علاقہ نہ تھا اور اگر تھا بھی تو ایک کمزور سا رشتہ۔

یہ حضرات ایک واضح تاریخی حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، یعنی اس عہد کے مختلف ملکوں کے مسلمانوں کا باہمی رابطہ اور رشتہ۔ مسلمانوں کی برادری ایشیا اور افریقہ میں پھیلی ہوئی تھی جس کو اپنی مشترک روایات و اقدار عزیز تھیں۔ تاریخ کے اوّلین ادوار میں ہر قوم اپنی ایک ''دیومالا'' مرتب کر لیتی تھی تاکہ اُسے اپنی وحدت کے لیے استعمال کیا جائے۔ مسلمانوں کو دیومالا کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ تو خود تاریخ کا عہدِ نو ہیں۔ اُن کی تاریخ اور روایات و اقدار نے دیومالا کی جگہ لے لی اور یہی روایات و اقدار اُن کی زندگی کے آفاقی رشتوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ادب بھی زندگی کا گوشہ ہے بلکہ زندگی کا لب اظہار...... اسی لیے یہ آفاقی رشتے ہمارے ادب کی قدر بن گئے یا یہ قدریں ہمارے ادب کے آفاقی رشتوں کی اساس بن گئیں۔ یہ حقیقت دو پہلو ہے اسی لیے دونوں طرح کہی جا سکتی ہے۔

پھر ''طور''، ''فاران''، ''دجلہ و فرات'' اور ''کربلا'' صرف مقامات ہی نہیں...... یہ تو آفاقی حقیقتوں کے استعارے اور اشارے ہیں۔

گرچہ ہے تاب ناک ابھی گیسوئے دجلہ و فرات
قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں

(اقبال)

وہ رن مجھ میں پڑا ہے خیر و شر کا
کہ اپنی ذات میں اک کربلا ہوں

(سلیم احمد)

حیات عرصۂ کرب و بلا میں گزری ہے
تمام عمر ہوئی ہیں شہادتیں کیا کیا

(لیث قریشی)

''فاران'' تکمیل ہدایت کا اشارہ ہے اور کوہِ طور ظرفِ نظر کا۔ ان اشاروں کی اہمیت اس بات کی متقاضی ہے کہ ان کے اطراف و جوانب کا احاطہ مستقل مضامین کی صورت میں کیا جائے۔

(۳)

ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے اسلامی اقدار کو اپنے شہ کاروں اور کلام میں اس طرح پیش کیا

ہے کہ وہ آفاقی حقیقتوں کے ذہنی مظہر کی طرح ابھری ہیں، اور ان میں روحِ عصر کا پرتو بھی نظر آتا ہے۔ شعوری یا غیرشعوری طور پر انسان اسلام کے بتائے ہوئے راستے پر آگے بڑھ رہا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ انسان وحی الٰہی کی روشنی میں جو راستہ آسانی سے پا سکتا ہے جب اپنی محدود عقل کی روشنی میں اسے تلاش کرتا ہے تو خسران کی صدیوں میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ قرآن حکیم نے چودہ سو سال سے پہلے آفاقیت اور وحدتِ آدم کا پیغام دیا تھا، اور انسان آج بیسویں صدی کے اختتام پر صرف بین الاقوامیت تک پہنچا ہے:

مکہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
''جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدمؑ''

اقدار کے سلسلہ میں خود اُن کی معنویت، قدر اور حیاتِ انسانی میں اُن کی اہمیت کے سوال ابھرتے ہیں۔ اسلامی اقدار کا تعلق حیات و کائنات، مقصد تخلیق، کائنات میں انسان کے مرتبہ اور اس کے اخلاقی خصائص، صداقت، خیر اور حسن کے علاوہ عدل عمرانی، فرد اور معاشرہ کے رشتے جیسے سوالات سے ہے۔ یہی وہ سوالات ہیں جن کا صحیح جواب نہ ملنے کی وجہ سے ایک طرف انسانی معاشرہ عدل و توازن کے لیے ترس رہا ہے اور دوسری طرف فکر و فن کی راہیں دھندلا گئی ہیں۔ آج کی شاعری اور ادب میں لا یعنیت کا احساس نمایاں ہے۔ خیال اور اظہار کے درمیان منطقی رشتہ کو توڑنے کی کوششیں ادبی تحریکوں کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ (Dadaism) اعلیٰ ادب، خدا، حیات اور کائنات کے درمیان سہ جہتی مکالمہ ہوتا ہے۔ آج کا ادب جو آفاقی اقدار سے لاتعلق ہے، خود کلامی اور وہ بھی غیر مربوط بن کر رہ گیا ہے۔

ہماری قدروں کا جن موضوعات و مسائل سے تعلق ہے، اُن کی طرف سے اس سے پہلے پیراگراف میں اشارہ کیا گیا۔ ضروری ہے کہ جدید ادب میں ان کے اظہار کا جائزہ لیا جائے۔ میں اپنے آپ کو حتی الامکان غزل اور بڑی حد تک آج کی پاکستانی غزل تک محدود رکھتے ہوئے چند مثالیں پیش کروں گا۔ یہ مثالیں میرے معروضات کی دلیل بھی ہیں اور ان سے ہمارے ادب کے آفاقی رشتے اور ادب کی آفاقی نوعیت بھی واضح تر ہو سکے گی۔ طوالت کی وجہ سے تبصرے سے گریز کروں گا، ہاں ربطِ کلام کے لیے چند اشارے کرتا چلوں گا۔

انسان کا مزاج، اس کی اخلاقی حس، غیرت، کائنات میں اپنے مرتبہ اور فرائض کا احساس۔ یہ آفاقی فکر اور اقدار کے بنیادی نکات ہیں۔ انسانی غیرت اور عظمت کی کتنی توانا تصویر میر صاحب نے

پیش کی ہے:

آبِ حیات وہی نا، جس پر خضر و سکندر مرتے تھے
خاک سے ہم نے بھرا وہ چشمہ، یہ بھی ہماری ہمت ہے

یہ خیال ہماری شاعری کی رگوں میں لہو کی طرح گردش کرتا رہا ہے۔ اقبال کے ہاں اس کا اظہار یوں ہوا ہے:

گدائے مے کدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمہ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

انسان تو موت کو زندگی نو کا دیباچہ بنا دیتا ہے۔ زندگی کا تسلسل اس کے دم سے ہے۔ یہ اس کی ہمت کا اعلیٰ تر مقام ہے۔

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر

(میر)

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

(اقبال)

موت کو ماندگی کا وقفہ کہنے اور چشمہ حیواں پر پہنچ کر سبو توڑنے والی یہ مخلوق درِ کسریٰ سے بیزار ہے۔ سامراج اس کے لیے تاریخ کا ایک کھنڈر ہے کہ اس نے اپنے آپ کو تلاش کر کے تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا ہے اور آج اس کے ہونٹوں پر یہ بول ہیں:

درِ کسریٰ پہ صدا کیا کرتا
اک کھنڈر مجھ کو عطا کیا کرتا

اپنے آپ کو تلاش کر لینے والا انسان آج بھی اپنی تلاش میں مصروف ہے۔ یہ تلاش کوئی کنارا، کوئی پایان نہیں رکھتی۔ اپنی تلاش میں اس کے تبصرے اور خود کلامی آفاقی شعر و ادب کے بہترین حصوں میں شامل کی جا سکتی ہے۔ اُردو شاعری میں اس کا سلسلہ بہت دُور تک پھیلا ہوا ہے:

میں کون ہوں اے ہم نفساں! سوختہ جاں ہوں
مخلوق ہوں یا خالق مخلوق نما ہوں

(مصحفی)

میر و مصحفی سے لے کر سراج الدین ظفر، رئیس امروہی، جمیل نقوی اور آج کے بیشتر شعراء تک۔
یہ بات کچھ کم اہم نہیں کہ ایسی بیشتر غزلیں مسلسل ہیں:

جہاں معبود ٹھہرایا گیا ہوں
وہیں سولی پہ لٹکایا گیا ہوں

(رئیس امروہوی)

ہیچ ہوں لیکن مہ و خور ہیں مرے زیر نگیں
کچھ نہیں لیکن دوعالم زیر پا رکھتا ہوں میں

(سراج الدین ظفر)

ازل سے ہوں تلاش میں خود اپنے ہی وجود کی
میں نغمہ الست کی صدائے بازگشت ہوں

(جمیل نقوی)

یہ شاعری ''عظمت آدم کی ترانہ بار شاعری سے قدرے مختلف ہے۔ یہاں آدمی نامہ کا سا تضاد بھی ہے اور ذہن غالب کے سے سوالات بھی۔

اپنی تلاش میں مصروف اور مبتلا انسان کا ہر راستہ اس کے معبود کی طرف سے ہو کر نکلتا ہے اور اس کے معبود تک جاتا ہے۔ آج کی اُردو غزل میں خدا سے تخاطب کا لہجہ ہماری شاعری کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ خدا سے قربت کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ آدمی اپنے آپ سے بیگانہ ہو جائے:

ترا جمال ہے، ترا خیال ہے، تو ہے
مجھے یہ فرصت کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں

(اصغر گونڈوی)

لیکن آج کے شاعر روشن تاریکیوں کے عہد میں سانس لے رہا ہے۔ وہ شدت کے ساتھ خدا کے اظہار کی دعا کرتا ہے اور اس سے وہ روشنی طلب کرتا ہے جو فریب نہ ہو اور یک روزہ نہ ہو۔

اتنی شدت سے ظاہر ہو
اندھوں کو بھی سجھائی دے

(سلیم احمد)

معبود کوئی تو روشنی دے
ہر روز دیا بدل رہا ہے

(رضی اختر شوق)

جدید پاکستانی غزل لا یعنیت، جسم کی تنگنائے اور چند روزہ تجرید کے عہد سے نکل کر آفاقیت اور آفاقی سوالوں اور جائزوں کے عہد میں دوبارہ داخل ہو چکی ہے۔ آج کا شاعر سچ کو زندگی کا وہ دریچہ سمجھتا ہے جس سے ماہ و سال کے محبس میں تازہ ہوا آتی ہے، وہ اپنے چہرے کو دیکھنے کا حوصلہ رکھتا ہے، اسے بے پیرہن روحوں کو پرکھنے کا سلیقہ اور کمال بھی آتا ہے، کمال اور سلیقہ یوں کہ جسم تو سراپا لباس ہے:

میں سوچتا ہوں کہ سچ کب تلک نہ بولیں گے
گھٹن بڑھے گی تو خود ہی دریچہ کھولیں گے

(سلیم کوثر)

ہم پھر بھی اپنے چہرے نہ دیکھیں تو کیا علاج
آنکھیں بھی ہیں، چراغ بھی ہے، آئینہ بھی ہے

(اقبال عظیم)

ایسے بھی لوگ ہیں جنہیں پرکھا تو اُن کی روح
بے پیرہن تھی، جسم سراپا لباس تھا

(مجید امجد)

انسانی زندگی اور مسائل کے اِن آفاقی گوشوں کے ساتھ ساتھ پاکستان شاعر اور ادیب زمان و مکان کے مسائل سے بھی نبرد آزما ہے کہ یہ مسائل اس کی میراث ہیں اور یہ مسئلے تقدیر انسانی سے وابستہ ہیں:

یہ لمحہ موجود کہ تم جس میں ہو زندہ
ٹوٹا ہوا پتہ ہے زمانے کے شجر سے

(امید فاضلی)

فنا کی چال کے آگے کسی کی کچھ نہ چلی
بساطِ دہر سے اُلجھے حساب داں کیا کیا

(امجد اسلام امجد)

یہ اشعار محض مثال کے طور پر پیش کیے گئے ہیں ورنہ حامد عزیز مدنی، منیر نیازی، تابش دہلوی، شاعر لکھنوی، قصری کانپوری، نازش حیدری وغیرہ سے لے کر کشور ناہید، پیرزادہ قاسم، ثروت حسین، محمد اجمل نیازی، پروین شاکر اور شاہدہ حسن وغیرہ تک ان آفاقی رشتوں کے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ نام بھی مثال کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ پھر، ہمارے ادب کے آفاقی رشتوں کا یہ مطالعہ صرف شاعری کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ آفاقیت کے ایک پہلو یعنی بین الاقوامی تحریکاتِ حریت سے اپنے ادب کے رشتہ کو بھی دائرہ مطالعہ میں شامل نہیں کیا گیا۔ یہ موضوع ایک کتاب کا مطالبہ کر رہا ہے اور بشرطِ فرصت و زندگی اس مطالبہ کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔

آخر میں یہ عرض کروں گا کہ ہمارے بیشتر ادیبوں اور شاعروں کے ہاں یہ آفاقیت، بعض نئے ادبی تجربوں کی طرح صرف فیشن یا مغرب کی نقالی کی بات نہیں۔ یہ آفاقیت اُن کے باطن سے ابھر کر لفظوں کے پیکر اور لباس میں ڈھلتی ہے اور اس پیکر اور لباس کے رنگ تتلی کے پروں کی طرح حسین اور زندگی کی طرح انمٹ ہیں۔ یہ سچے موسم کے سچے رنگ ہیں۔ اطہر نفیس نے اس حقیقت کو کس طرح اپنی گرفت میں لیا ہے:

خود اپنے ہی باطن سے اُبھرتا ہے وہ موسم
جو رنگ بچھا دیتا ہے تتلی کے پروں پر

استفادات

۱۔ معارف القرآن، مفتی محمد شفیع مرحوم
۲۔ تفہیم القرآن، مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم
۳۔ لغات القرآن، مولانا عبدالرشید نعمانی
۴۔ لغات القرآن، چوہدری غلام احمد پرویز
۵۔ کلیاتِ بلھے شاہ، مطبوعہ پنجابی ادبی اکیڈمی، لاہور
۶۔ مقالاتِ تقریباتِ شاہ عبداللطیف بھٹائی، ۶۰-۱۹۵۹ء
۷۔ ہیر وارث شاہ، مطبوعہ جے ایس سنت سنگھ، لاہور
۸۔ Dictionary of World Literature Edited by Shipley, J. T
۹۔ The Sublime by Mork, S.H
۱۰۔ اُردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر، ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک، سیّد ابوالخیر کشفی

☆☆☆☆☆